ڈاکٹر طیبہ نگہت

اسسٹنٹ پروفیسر

گورنمنٹ کالج ویمن یونی ورسٹی فیصل آباد

ڈاکٹر عظمیٰ بشیر

اسسٹنٹ پروفیسر، وزیٹنگ

گورنمنٹ کالج ویمن یونی ورسٹی فیصل آباد

غالبؔ اور جونؔ ایلیا کا تصورِ کائنات

The Cosmological Concept of Ghalib and Joan Ailia

ABSTRACT

The Scientific cosmological concept is demonstrated first time in Ghalib's poetry through out the historical tradition of Urdu poetry and then in the Poetry of laureate Modern Urdu poet Jaun Ailia in more comprehensive manner. This research article strives to discover some commonalities regarding cosmological concepts of today's scientific theories and Ghalib's Concept of Universe. However, Ghalib is more systematic and science oriented than Jaun Ailia and his approach towards stars as well as all the cosmological beings, is theological, where that of Jaun Ailia is metaphysical in nature and based on skepticism, because of philosophical implications of Jaun Ailia .

Key words:

Poetry, Ghalib, Jaun Ailia, astronomy, astrophysics, cosmological concept

اردو شاعری میں مابعد الطبیعاتی موضوعات کو پیش کرنے کا اگرچہ آغاز خواجہ میر دردؔ کے صوفیانہ شعری مزاج کا مرہونِ منت ہے لیکن ان موضوعات کا دائرہ کار صرف تصوف تک محدود تھا۔ کائنات ومافیہا کو شاذ و نادر ہی کسی نے موضوعِ سخن بنایا۔ اس لیے اردو شاعری میں کائنات، نظامِ کائنات اور کائنات و موجودات کے ساتھ انسان کے فکری اور وجدانی رشتوں کی بازیافت کو باقاعدہ ایک فکری نظام کی لڑی میں پرو کر پیش کرنے کا سہرا غالبؔ کے سر جاتا ہے۔ ان کے بعد اقبال نے بھی اس ضمن میں اپنے بصیرت افروز خیالات سے اردو شاعری کا

دامن وسیع کیا۔ اسی طرح جون آیلیا کے ہاں بھی نظام کائنات اور کائنات و موجودات کا انسان کے ساتھ فکری و حسی رشتے پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔

کائنات روزِ ازل سے نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق ذاتِ باری تعالیٰ نے کی اور پھر اس میں زمان و مکان کو مقید کر دیا۔ کائنات کا تصور انسان کے مختلف ارتقائی ادوار میں ترقی پذیر رہا ہے اور اس کی ابتداء، ارتقاء اور انجام کے متعلق مختلف قسم کے نظائر دیے جاتے رہے ہیں۔ آج کے جدید سائنسی دور میں Big Bang Theory کو ہی حتمی مان لیا گیا ہے اور کائنات کے آغاز کے متعلق مادیت پسندوں کے باقی تمام نظریات کو رد کر دیا گیا ہے۔ کائنات ایک انتہائی کثیف اور مرتکز مادے کے پھٹنے اور پھیلاؤ کی وجہ سے وجود میں آئی ہے اور وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو سوال کیا جاتا ہے کہ کائنات سے پہلے کیا تھا اور اسے کس نے پیدا کیا؟ اس کا حتمی نظریہ غالبؔ کے ہاں موجود ہے لیکن پہلے قرآنِ مجید سے رجوع کرتے ہیں جو اس حقیقت کو اِن اَلفاظ میں بیان کرتا ہے:

"أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا"(۱)

یعنی یہاں قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ تو کیا ان کافروں نے نہیں دیکھا کہ جملہ آسمانی کائنات اور زمین (سب) ایک اِکائی (singularity) کی شکل میں جڑے ہوئے تھے، پس ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔

قرآن کی متذکرہ بالا آیت میں "رَتْق" اور "فَتْق" کے الفاظ کائنات کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے بڑی گہری معنویت کے حامل ہیں۔ لفظ "رَتْق" کے معنی کسی شے کو ہم جنس مواد پیدا کرنے کے لئے ملانے اور باندھنے کے ہیں۔ اور دوسرے لفظ "فَتْق" کے معنی پہلے لفظ کے الٹ یعنی توڑنے، جُدا جُدا کرنے اور توڑ کر الگ کر دینے کے ہیں۔

گویا یہ دونوں الفاظ زمین و آسمان کی باہمی آمیزش اور وحدت (Singularity) کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کائنات ایک مرتکز صفر درجہ اکائیت کی صورت میں تھی اور عظیم دھماکے (Big Bang) کے بعد خلائے بسیط میں بکھر گئی۔ تخلیقِ کائنات کے متعلق یہ نظریہ آج سے چودہ سو سال قبل ہی قرآنِ مجید نے عرب کے ایک جاہل معاشرے میں بیان کر دیا تھا جسے بیسویں صدی کے وسط میں جدید علمِ تخلیقیات (cosmology)، علمِ فلکیات (astronomy) اور علمِ فلکی طبیعیات (astrophysics) کے ماہرین نے بالکل اسی طرز پر اپنا تصورِ کائنات قائم کیا۔ اسی طرح مسلم فلاسفہ کے ہاں بھی کائنات کا وہی نظریہ مقبول و رائج رہا ہے جو ابنِ قرآن کی

تعبیری صورتوں میں قابلِ قبول تھا اور فارسی شاعری میں مولانا رومؒ کی وساطت سے اردو میں یہی تصورِ کائنات قائم رہا ہے۔ غالبؔ کے ہاں کائنات کی تخلیق اور ارتقاء کا جو تصور ملتا ہے اس کے ڈانڈے اسلامی مکتبۂ فکر اور فلاسفہ ایران سے ملتے ہیں۔ غالب کا کائنات کا تصور لاشئیت سے شئیت یعنی کتمِ عدم سے وجودِ کائنات کو برآمد کرنے والی جس ہستی کا تصور ملتا ہے، وہ خدا ہی ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (۲)

غالبؔ کا تصور کائنات کسی منظم صورت میں ہونے کے بجائے ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے موتیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ غالب کسی خاص نظریہ حیات کا قائل نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے وجود کی دریافت کے بعد لمحہ موجود میں، وجود اور کائنات کے درمیان رشتوں کو دریافت کرتا ہے اور اسی سے اپنا نظریہ کائنات تشکیل دیتا ہے۔ غالب کے ہاں تصورِ کائنات اسی طرح بکھرا ہوا ہے جس طرح آفرینش کے تمام اجزاء خلائے بسیط کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور یہ اجزاء اپنی مخصوص عمر پوری کرنے کے بعد فنا ہو کر ختم ہونے والے ہیں یا مادے کی کسی اور شکل میں منتقل ہونے والے ہیں۔ اس کے متعلق غالب نے بڑے دوٹوک الفاظ میں جو خیالات پیش کیے ہیں، وہ آج کے سائنسی دور کے علم الفلکیات میں بھی جوں کے توں رائج ہیں۔ سائنس یہ کہتی ہے کہ ہر ستارہ اپنی ہاف لائف یعنی آدھی عمر پوری کرنے کے بعد زوال کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ ستارے میں موجود گیسوں ہیلیم اور ہائڈروجن کا تناسب بگڑنے لگتا ہے اور ستارہ اپنی طبعی عمر پوری کرنے کے بعد بے نور ہو کر ایک عظیم کثافت کے حامل بلیک ہول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ غالبؔ نے جدید سائنس کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن زمینی حیات و موجودات کی شکست وریخت اور تعمیر و تخریب کے اعمال کے مشاہدے سے اس نے جو نتائج اخذ کیے تھے، انھی کی روشنی میں اس کا وجدان اُسے کائنات کے بارے میں آج کی سائنسی صداقت لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں (۳)

غالب یہاں پر یہ کہہ رہا ہے کہ آفرینش یعنی ابتدائے کائنات سے لے کر اب تک جتنے بھی اجرام فلکی یا ستارے اور سیارے ہیں وہ سبھی اپنی فطرت میں زوال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سورج بھی ہوا میں رکھے ہوئے

ایک چراغ کی طرح ہے، جسے ایک دن بھر جانا ہے۔ اس کی ایک عمر ہے اور عمرِ طبیعی پوری کرنے کے بعد زوال اس کا مقدر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ غالب نے اس دور میں کائنات و موجودات کے بارے میں وہ تصور پیش کیا جب سائنسدان کائنات اور اس کی ماہیت کے متعلق بالکل نابلد تھے۔ آج یہ ایک سائنسی صداقت ہے کہ بڑے سے بڑے سورج سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے سیارے تک اپنی کیمیائی ترکیب کے لحاظ سے ایٹم سے بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہر ایٹم کا ایک ہاف لائف ٹائم پیریڈ ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر ستارے کی بھی عمر معین ہے جس کے بعد اسے ختم ہو جانا ہے اور ستارہ جب ختم ہوتا ہے بلیک ہول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے سورج کی عمر تقریبا ساڑھے چار ارب سال ہے اور قریب قریب اتنی ہی باقی بچی ہے، جس کو پورا کرنے کے بعد ہمارا سورج بھی بلیک ہول میں تبدیل ختم ہو جائے گا۔ غالبؔ نے مجموعی سطح پر آفرینش کے تمام اجزاء کے زوال کی بات یہاں پر کی، جس میں نباتات و جمادات اور حیوانات سبھی آتے ہیں۔ گویا وہ ہر چیز جس کی ابتدا ہے اور زمان و مکان کی زد میں ہے، اُسے ایک ساعت پر ختم ہونا ہی ہے۔

اسی طرح کائنات کے بارے میں آج سے تقریباً سو سال پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ستارے روزِ اوّل سے ہی موجود ہیں اور یہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ دائم آباد رہیں گے اور ان پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ اردو اور فارسی شاعری میں بھی کچھ اسی طرح کے خیالات ملتے ہیں، لیکن غالبؔ نے اپنی طبعی انفرادیت کی وجہ سے روشِ عام سے انحراف کیا ہے اور باقی مخلوقات کی طرح ستاروں کو بھی زوال آمادہ دکھایا ہے۔

زمانہ ماضی کا یہ خیال بھی کائنات کے متعلق تھا کہ اجرامِ فلکی ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ یوں ہی رہیں گے۔ غالبؔ سے پہلے اردو شاعری میں آسمان کی بات تو ہوتی تھی، لیکن وہ ایک مخصوص معنویت کی حامل تھی اور آسمان کو شاعر کے لیے کے لیے ناگہانی آفات نازل کرنے کی علامت کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ غالبؔ نے آسمان کے اس روایتی تصور سے باہر نکل کر تمنا کے دوسرے قدم کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو کائنات کے بارے میں اس نے اپنے علم اور وجدان سے نئی دریافت کی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مخلوق کی طرح اجرامِ فلکی بالخصوص ستارے بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اب یہ ایک سائنسی حقیقت بن چکی ہے کہ ہر روز نئے ستارے بنتے ہیں اور ستارے بے نور ہو کر ختم بھی ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ غالبا اس بارے میں غالبؔ کہتا ہے:

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے(۴)

غالبؔ نے دوسرے مصرعے میں بڑے وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ آسمان کے لیے نئے ستارے بنیں گے۔ گویا پرانوں کی جگہ نئے ستاروں نے لینی ہے اور اس طرح فطرت کا یہ چکر ہمیشہ چلتا رہنا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ غالبؔ کے ہاں کائنات کا تصور اساطیری تعبیرات سے آزاد ہے اور منظم فلسفیانہ تعبیرات اور سائنسی شعور کا حامل ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے علم کی وہ دریافت ہے جو رموزِ کائنات کو جاننے کے لیے اس کے مرغِ تخیل کو ہمیشہ محوِ پرواز رکھتی ہے۔ اور غالب نے جس ادائے خاص سے اپنا نکتۂ نظر پیش وہ آج بھی اپنے وجود کے جواز کے لیے سائنسی صداقت کا بھرپور شعور کا نمائندہ ہے۔ کائنات ارب ہا قسم کی کہکشاؤں کا مجموعہ ہے اور ہم جس کہکشاں میں رہتے ہیں، اُسے ملکی وے گلیکسی کہا جاتا ہے۔ اس کہکشاں میں ناسا(NASA) کے مطابق ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر لمحہ نئے ستارے کروڑوں کی تعداد میں بن رہے ہیں:

> A nebula is a giant cloud of dust and gas in space. Some nebulae (more than one nebula) come from the gas and dust thrown out by the explosion of a dying star, such as a supernova. Other nebulae are regions where new stars are beginning to form. For this reason, some nebulae are called "star nurseries."(5)

گویا نیبولا گیسوں اور خلائی گرد و غبار کا ایک ایسا عظیم الجسامت بادل ہے جہاں پرانے ستارے مر رہے ہیں اور نئے ستارے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ ستاروں کی وہ نرسری ہے جہاں نئے ستاروں کی پیدائش کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ محولہ بالا شعر میں غالب نے بہت پہلے کائنات کے بارے میں علم الفلکیات کی اس جدید دریافت کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ آسماں کی آرائش کے لیے اور ستارے ضرور بنیں گے اور لوگوں کو بھی ایک نہ ایک اس کائناتی صداقت کا ضرور علم ہو جائے گا۔ یہ غالبؔ کا وجدانی علم ہی تھا جس نے اسے کائنات اور اس میں پوشیدہ اسرار و رموز کی معرفت عطا کی تھی۔

کائنات کی وسعت کے بارے میں جس قدر بھی جدید نظریات علم الفلکیات نے پیش کیے ہیں، اُن سب میں ایک چیز بڑی مشترک ہے اور وہ یہ کہ کائنات لمحہ بہ لمحہ پھیل رہی ہے اور اس کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ یہ جہان جس میں ہم رہتے ہیں بڑا ہی محدود اور مختصر ہے اور ہمارے نظامِ شمسی کی وسعتیں کائنات کی

وسعتوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس امر کا ادراک غالب کو بھی تھا، اسی لیے تو اُس نے کائنات کی وسعتِ بے کراں کی خواہش کی تھی کہ جب یہ دشتِ امکاں اُس کے سامنے فقط ایک نقشِ پا جتنے امکانات کا حامل رہ گیا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقشِ پا پایا (۶)

غالبؔ نے لوگوں کو یہ دعوتِ فکر دی تھی کہ وہ کائنات کو نئی سائنسی حقیقت کی روشنی میں دیکھیں جو بہت بعد میں کُھلی۔ غالبؔ انتہائی واضح قسم کے سائنسی ادراک کا حامل شخص ہے جو اپنے عقلی حسیات اور وجدانی مُدرکات کے باہمی طفیل اپنی شاعری میں کائنات کا واضح تصور تشکیل دینے میں کامیاب ہوا ہے۔

اسی طرح جون ایلیا کی شاعری میں بھی کائنات کا بڑا واضح تصور ملتا ہے۔ جونؔ ایلیا کائنات اور انسان کے درمیان رشتوں کو دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کا سائنسی شعور اسے کائنات کے محض روایتی تصور پر اکتفا نہیں کرنے دیتا اور وہ کائنات اور اس کے ارتقاء کے متعلق زیادہ بہتر اور نفیس نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کی بعض نظموں جیسا کہ ''رمزِ ہمیشہ''میں تصورِ کائنات کے متعلق ایسی نامیاتی وسعت موجود ہے جو کاسمالوجی (Cosmology) کے موضوع پر لکھے جانے والی دنیا کی بہترین نظموں کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہے۔ جونؔ ایلیا کا تعلق چونکہ فلسفے سے بھی تھا اور فلسفے کے اسرار و رموز کو بڑی باریک بینی سے جانتے تھے۔ فلسفے کا موضوع چونکہ ''انسان، کائنات اور خدا'' ہوتا ہے، لہٰذا جونؔ ایلیا کی شاعری میں خدا، کائنات اور انسان کے درمیان جہاں پوشیدہ رشتوں کو دریافت کرنے پر زور دیا گیا ہے، وہاں کائنات اور اس کے ارتقاء کے بارے میں واضح تصورات ملتے ہیں۔ ان خیالات کی تشکیل کے پیچھے ان کے فلسفیانہ انداز سے سوچنے اور کائنات و موجودات کا مشاہدہ کرنے کا ہاتھ ہے۔ جونؔ ایلیا اگر وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق بات کرتا ہے تو اس میں استفہامیہ انداز ہوتا ہے۔ خدا کے وجود کا وہ کلی طور پر قائل ہے اور یقین رکھتا ہے۔ لیکن فلسفیانہ تشکیک یہاں پر بھی اسے کھوج اور سوال قائم کرنے سے باز نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موجود اور وجود کے حوالے سے فلسفیانہ انداز میں بحث کرتا ہوا نظر آتا ہے:

موجودی سے انکاری ہے اپنی ضد میں نازِ وجود
حالت سی حالت برپا ہے اللہ ہو کے باڑے میں (۷)

اسی طرح یہ شعر دیکھئے:

بود و نبود کا حساب میں نہیں جانتا مگر
سارے وجود کی ''نہیں'' میرے عدم کی ''ہاں'' میں ہے(۸)

جون آیلیا کے ہاں ں یہ فلسفیانہ انداز خدا کے بارے میں ان کے فلسفیانہ مزاج کی وجہ سے ہے۔ وہ بعض اوقات عام مذہبی روایات سے انحراف کرتے ہوئے کہتا ہے:

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا(۹)

یقین اور گمان کے درمیان بے یقینی اور بے گمانی کے زینوں پر قدم رکھنا ہر فلسفی کا بنیادی مزاج ہے۔ وجودِ باری تعالیٰ اور کائنات و موجودات کو تخلیق کرنے والی طاقت اور ایجنسی کے بارے میں فلسفہ اور فلسفی ہمیشہ سے بحث کرتے آئے ہیں۔ اور کسی ٹھوس اور مادی شواہد سے وجودِ باری تعالیٰ کو ثابت کر پائے ہیں نہ ہی تلاش کر پائے ہیں۔ گویا گمان اور یقین کے بین بین کی جو کیفیتِ ذہنی ان کے ہاں ملتی ہے، اُردو شاعری میں اس کا حسین ترنمونہ جون آیلیا کی شاعری ہی میں نظر آتا ہے۔ یہ اشعار انہی امور کی نشاندہی کرتے ہیں:

ہوں مبتلائے یقیں، میری مشکلیں مت پوچھ
گمان عقدہ کشا بھی نہیں رہا اب تو(۱۰)

عدم اور وجود کے بارے میں جون آیلیا کے ہاں بڑے واضح تصورات ملتے ہیں۔ کائنات کا نظام ایک ترتیب سے چل رہا ہے۔ اس کے اندر جو یک لخت عمل رونما ہوتا ہے، وہ بھی کسی نہ کسی ترتیب و تنظیم کا پابند ہوتا ہے۔ انسان بعض اوقات اس کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کے اسرار و رموز کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ جون آیلیا کے ہاں بھی اس قسم کا کم و کیف موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظم اور مربوط نظام کائنات کی ابتدا یک لخت ابتدا کے متعلق بعض اوقات وہ طنز کرنے پر اتر آتا ہے لیکن ساتھ ہی اگلے شعر میں اس بات کا اقراری ہے کہ انسان کی تخلیق اسی فطرت پر ہوئی ہے جو خالق کی فطرت ہے اور اس سے اگلے شعر میں جون کی شوخی ئ گفتار کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ ''اے خدا'' کہہ کر ''جو کہیں نہیں موجود'' کا اضافہ کر کے اصل میں نفی بمعنی اثبات کا اعادہ کرتا ہے:

حاصل کن ہے یہ جہان خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں
پھر بنایا خدا نے آدم کو
اپنی صورت پہ ایسی صورت میں

اے خدا (جو کہیں نہیں موجود)
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں(۱۱)

یہ فلسفیانہ قسم کا طنز ہے جو کائنات کی ابتداء کے متعلق کیا گیا ہے۔ کسی بھی چیز کی تخلیق مرحلہ وار ارتقاء سے گزرتی ہے۔ لیکن ہماری مذہبی روایات میں کائنات و موجودات کی تخلیق کے بارے میں ''کن فیکون'' کا جو نظریہ ہے اسے جون ایلیا من و عن قبول کرنے کے لئے راضی نہیں، کیونکہ نظام کائنات میں ارتقاء کی جو صورتیں موجود ہیں، وُہ کائنات کے یک لخت خلق ہو جانے کی غمازی نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس جون ایلیا نفی اور انکار کرنے کے بجائے استفہامیہ انداز میں طنز کرتا ہے۔ یہ طنز کبھی چیلنج کی صورت میں یوں رونما ہوتا ہے جس طرح ان کی نظم'' بے اثبات''، میں اپنے وجود کے اثبات کے متعلق رونما ہوا ہے:

"کس کو فرصت کہ مجھ سے بحث کرے
اور ثابت کرے میرا وجود.....
زندگی کے لیے ضروری ہے۔"(۱۲)

جون آیلیا کے تصورِ کائنات کے بارے میں واضح طور پر جاننے کے لیے ان کی نظم ''رمزِ ہمیشہ'' بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نظم علم الفلکیات، علم البشریات اور فلسفہ ئ وجودیت کا حسین امتزاج ہے۔ اس نظم میں جون ایلیا نے مکالماتی انداز اختیار کیا ہے اور خدا سے ہم کلام ہو کر اپنی ہستی کے خدا سے فیض یاب ہونے اور پھر ارتقائے انسانی کا جو احوال بیان کیا ہے وہ جون آیلیا کے تصورِ کائنات کو سمجھنے کے لیے انتہائی توجہ طلب ہے۔ اس نظم کی ابتدا ہی بڑے مسحور کن انداز میں ہوتی ہے، جو آگے چل کر ایک واضح کائناتی تصور میں ڈھل جاتی ہے۔ آغاز سے نظم ملاحظہ کیجیے:

"اے خدا، اے خدایاں خدا، اے خداوند

میں تجھ سے معمور تھا، خود سے مسحور تھا

اور ایک میں ہی کیا، نیلگوں آسمانوں سے دیوان خانے کی

سرسبز، نکہت نفس، کیاریوں تک کا سارا سماں تجھ سے معمور تھا

خود سے مسحور تھا، شہر میں معجزوں اور، موسم کے میووں کی بہتات تھی، اور میووں کی چاہے کسی فصل میں، کچھ بھی کمی ہوئی ہو، مگر معجزے روز افزوں تھے، ایمان کا ابر باذل، دلوں کی زراعت کو شاداب رکھتا تھا، شام و سحر اپنے مرموز آغاز و انجام کے، حسن میں محو رہتے تھے۔"(۱۳)

کائنات کے ارتقا کے برعکس یہ انسان کی ذہنی طمانیت کا وہ کم و کیف ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اسے روزِ ازل سے میسر تھا اور جون ایلیا کے بقول یہ کم و کیف ایک حسین اور اطمینان بخش خواب کے مانند تھا۔ اس نظم میں آگے چل کر "ابنِ سکیت" جو عباسی خلیفہ متوکل کے دور کا ایک مشہور فلسفی و عالم تھا، کے متعلق شہر کے ایک شیوا بیاں اور خوش لہجہ نثار کی جون ایلیا کے والد سے گفتگو شامل ہے اور اسی مکالمے کے ذریعے سے نظم کے موضوع کو خدا، کائنات اور انسان کے باہمی رشتوں کی دریافت کے متعلق موڑ دیا گیا ہے۔ یہاں سے ہی "یقین" کی دیوار میں عقل گمان کی پہلی نقب لگاتی ہے۔ اس سے قبل تو جون کہتے ہیں کہ وہ ذہنی آسودگی اور یقین کے جس درجے پر تھے وہ انسان کی کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں ابتدائی نظریات کی عکاسی کرتا ہے:

"وہ خجستہ وہ خوش ماجرا روز و شب، روز و شب ہی نہ تھے

اک زمانِ الوہی کا انعامِ جاری تھے

اور ایک رمزِ ہمیشہ کا، سرچشمۂ جاوداں تھے

وہ سرچشمۂ جاوداں جس کی تاثیر سے

اپنا احساسِ ذات الہام تھا

جس سے روحِ در و بام سرشار تھی

اس فضا میں، کوئی شئے، فقط شئے تھی

ایک معنی تھی، معنی کا فیضان تھی۔"(۱۴)

''رمز ہمیشہ''، جون ایلیا کے تصورِ کائنات اور انسان کے ارتقائی خیالات کی حسین ترجمانی کرتی ہے۔اس نظم میں شاعر نے بتلایا ہے کہ کس طرح سے انسان نسلاً بعد نسل یقین سے گمان اور تشکیک کی جانب گیا ہے اور کائنات کے ازلی وابدی خالق کی تفہیم جب عقلی سطح پر کی تو کیا مشکلات اس کے سامنے پیش آئیں۔

دہر در دہر اور دیوم دیوم میں
اب عدم در عدم کے سوا کچھ نہیں
اے خداوند تو کیا ہوا
مجھ کو تیرے نہ ہونے کی عادت نہیں
وائے بر حالِ ژرفا و بالا و پہنا
دریغا! سبب ہر مسبب سے اپنے جُدا ہو گیا
حسرتا! کہکشاؤں کے گلوں کا چوپان کوئی نہیں
اور پھر میں نے، موجود کے دائرے کی نہایت پہ نالہ کیا
اے یقیں کے گماں، اے گماں کے یقیں، اے ازل آفریں، اے ابد آفریں
اے خدا، الوداع، اے خدایاں خدا، الوداع الوداع''(۱۵)

ایسا شخص جو موجود کی نہایت کے دائرے پہ نالہ کرے وہ اپنے وجدان میں نہ صرف یہ کہ خدا کا کامل تشخص رکھتا ہے بلکہ کائنات کے متعلق بھی ایک واضح تصور کا حامل ہوتا ہے۔جون ایلیا کی شاعری پڑھ کر ہمیں جہاں کربِ آگہی کا علم ہوتا ہے وہاں ان کے تصورِ کائنات کی بھی تصویر کشی ممکن ہے۔اسی طرح کائنات کی تخلیق، تنظیم وارتقا کے متعلق غالب کا نظریہ زیادہ مضبوط اور مربوط ہے۔غالبؔ نے اشیاء و موجودات کی ماہیت پر زیادہ واضح انداز میں سوال قائم کیے ہیں:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے(۱۶)

کائنات و موجودات کی ماہیت، ابتدا اور ارتقا کے متعلق استفہام کا یہ قرینہ اردو غزل میں بالکل نیا ہے اور غالب سے استعمال میں نہیں لایا گیا۔ غرض یہ کہ غالب اور جون ایلیا کے ہاں تصورِ کائنات میں بہت سی اقدار مشترک ہیں۔ دونوں شاعروں نے اپنے شعری نظام کی تشکیل میں کائنات کے تصور کو اساسی اہمیت دی ہے۔ کائنات و موجودات کی تخلیق اور ان کے خالقِ کائنات کے متعلق غالب کی فکری رسائی سائنسی اور الوہی مابعدالطبیعاتی نوعیت کی ہے جبکہ جون ایلیا کے ہاں مذہبی مابعد الطبیعات (Theological Metaphysics) کے نکتۂ نظر سے کائنات اور انسان کے رشتوں کو سمجھنے کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ القرآن:الانبیاء،30:21

۲۔ مرزااسداللہ خاں غالب:''دیوانِ غالب''شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،لاہور،۱۹۶۷ء،ص۹۶

۳۔ ایضاً ،ص۱۱۸

۴۔ ایضاً ،ص۴۳۷

۵۔ Retrieved:https://spaceplace.nasa.gov at 3:30 PM on 01-02-2021

۶۔ مرزااسداللہ خاں غالب:''دیوانِ غالب''شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،لاہور،۱۹۶۷ء،ص۳۳۲

۷۔ جون ایلیا:''گمان''الحمد پبلی کیشنز،لاہور،ص۲۰۰۴ء،ص۱۷

۸۔ ایضاً ،ص۲۲

۹۔ جون ایلیا:شاید،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴،ص۱۴۹

۱۰۔ جون ایلیا:''گمان''الحمد پبلی کیشنز،لاہور،ص۲۰۰۴ء،ص۴۶

۱۱۔ جون ایلیا:شاید،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴،ص۱۲۲

۱۲۔ ایضاً ،ص۷۸

۱۳۔ ایضاً ،ص۷۹

۱۴۔ ایضاً ،ص۸۰

۱۵۔ ایضاً ،ص۸۱

۱۶۔ مرزااسداللہ خاں غالب:''دیوانِ غالب''شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،لاہور،۱۹۶۷ء،ص۱۶۷